سے مل سکتی ہے۔ یہی دین ان کی اس دنیا میں بچی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس نئے دور میں جو جدید تفسیریں لکھی گئیں ہیں یا لکھی جارہی ہیں۔ ان میں نوے فیصد پرانی باتوں کی تکرار ہے۔ وہ جدید صرف اس لیے ہیں کہ عصر جدید میں لکھی گئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ عصر جدید کی صحیح نمائندگی نہیں کرتیں۔ ان میں زمانہ حاضر کے مسائل کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔

نتیجتاً یہ ہمارے دور کی ضرورت کو پورا نہیں کرتیں۔ اسی لیے یہ مسلم معاشرہ میں کوئی تبدیلی برپا نہیں کر سکیں۔ لہذا اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت خالص علمی انداز میں قرآن مجید کی تفسیر دنیا کے سامنے پیش کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ قرآن کی ایسی تفسیر جس کا خطاب تمام اہل عالم سے ہو۔ قرآن کی اساسی تعلیمات اس کے مقاصد اور افکار کو مربوط اور خالص علمی انداز میں پیش کیا جائے جس سے دنیا متاثر ہو۔

....

زوج اور سوت دو متقابل اصطلاحیں

ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج
استاذ الفقہ والتفسیر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

سوکن، سوتن یا سوت وہ الفاظ ہیں جو ہماری زبان میں رائج ہو کر ہماری معاشرت کا حصہ بلکہ خاصہ بن چکے ہیں۔ بدقسمتی اور لاعلمی سے ہم نے اسے فطرت اور شریعت بھی سمجھ لیا ہے۔ چونکہ سوت یا سوکن کے الفاظ منفی مطالب و مفاہیم پر مشتمل ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں سوکن یا سوت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اسلام میں جو تصور دیا گیا ہے کہ وہ سوت کی بجائے زوج کا ہے۔ لیکن کم فہموں نے زوج کو سوت پر محمول کر رکھا ہے۔ پھر سوت کے لفظ سے سوتاپا (اردو) اور سوتیاڈاہ (ہندی) کے الفاظ بنائے گئے ہیں۔ جس کے معنی ہیں۔ دو سوکنوں کے درمیان کی دشمنی۔ (۱)

کتابستان انگلش ڈکشنری میں اس کے معنی بایں الفاظ لکھے گئے ہیں۔ Heart Burming Caused by Co-Wife.۔ علمی لغت میں سوت کے لفظ کے ساتھ، جو محاورے درج کیے گئے ہیں۔ ان میں بھی منفی معنی موجود ہیں۔ مثلاً "سوت بھلی سو تیلا بُرا۔ یعنی سوکن کی اولاد سوکن سے بھی بری ہوتی ہے۔ سوت کا لاناجی کا جلانا۔ یعنی دوسری عورت کو لانا۔ پہلی کو زندہ در گور کرنے کے برابر ہے"۔ (۲) کتابستان اردو انگلش ڈکشنری میں لکھا گیا ہے۔ سوت پر سوت اور جلا پا یعنی (۳)A third Co-wife is worse then the second for the first one.

سوکن یا سوت کا لفظ، اردو زبان میں اس بیوی کے لیے بولا جاتا ہے، جو پہلی بیوی پر لائی جائے۔ اسی طرح ایک خاوند کی دو بیویاں بھی باہم۔ سوکن کہلاتی ہیں۔ اردو ادب میں سوکن کے لفظ کے ساتھ بھی کئی کہاوتیں مشہور ہیں۔ مثلاً سوکن بری ہے چون کی اور ساجھے کا کام، بگاڑا کریل کا اور بدری کی گھام۔ یعنی سوت برائے نام ہو تو بھی بری ہے۔ یہی حال شرکت کے کام کا ہے۔ کریل کا ناو اور برسات

کی گھمس بھی اچھی نہیں (گھام۔ گھمس۔ پسینہ) (جامع الامثال)

سوکن بھگتی جائے اور سوتیلا نہ بھگتا جائے۔ یعنی سوکن کے مقابلے میں اسکی اولاد سے زیادہ دکھ پہنچتا ہے۔

(ماخوذ: نجم الامثال)

سوکن تو چون رچوتی کی بھی بری۔ یعنی سوت چاہے ناچیز اور کمتر ہو، بہر حال گوارا نہیں۔ نہ جانے کس وقت نقصان پہنچادے، حریف بہر صورت حریف ہے۔

سوکن جلاپا، کس کو بھایا۔ یعنی سوکن کی اولاد سے محبت نہیں ہوتی۔

سوکن زہر کی چھری، ایک بھی بری۔۔۔۔ سوکن مرگئی آنکھ چھوڑ گئی۔ (۳)

اسلام کے تعدد ازواج کے تصور کو بے رحمانہ بلکہ ظالمانہ ثابت کرنے کے لیئے، سوکن یا سوت کے لفظ کا جو استعمال بلکہ سوء استعمال کیا گیا ہے۔ وہ دراصل وحی خداوندی کے تقدس کو پامال کرنے کی سازش معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا ساری کہاوتیں اور محاورے دراصل ہندوستانی معاشرت کے عکاس ہیں۔ اس طرح کی کہاوتیں اور محاورے آپ کو عربی زبان وادب میں نہیں ملیں گے۔ کیونکہ ان کے ہاں زوج اولیٰ کی موجودگی میں زوج ثانی کا تصور، مذکورہ بالا محاوروں اور کہاوتوں کے مطابق نہیں۔ ان کہاوتوں میں ہندی الفاظ کی آمیزش سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ سوکن کے تعلق سے یہ سطحی تخیلات، گھٹیا تصورات اور منفی نظریات کہاں سے آئے ہیں اور کس معاشرت کی چغلی کھاتے ہیں۔

بلاشبہ ہندوستان کی مسلم معاشرت پر مذہب غیر کی معاشرت اثر انداز ہوئی ہے اور اس نے ان کے زبان وادب میں اپنے منفی کلچر کا عکس منتقل کیا ہے۔ اس لیئے قرآنی اجازت، کے باوجود مسلمانوں کے ہاں بھی دوسری شادی کا تصور تقریباً ناقابل قبول بن کر رہ گیا ہے۔

وحی خداوندی کی رو سے دوسری شادی کا تصور اپنی روح کے اعتبار سے ایک مثبت عمل تھا اور ہے۔ جسے جہالت کے سبب، ہماری معاشرت میں منفی سمجھا گیا ہے۔ اس لیئے تاکسین ثانی کو بالعموم اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ نکاح ثانی کے خلاف معاشرہ کی اس سپورٹ نے اس خالصتاً فطری اور شرعی عمل کو جنسی ہولناکی اور عورت پر ظلم کا عنوان دے رکھا ہے۔ اور اس ردعمل سے معاشرے میں غیر فطری اور غیر شرعی رویوں نے فروغ پایا ہے۔

ہمارے خیال میں نکاح ثانی کو سوکن کے تصور سے ملوث کرنے والوں نے دراصل قرآنی حسن معاشرت کے تصور کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ سوکن کا مروجہ تصور، غیر اسلامی معاشرہ میں تو ممکن ہے۔ اسلامی معاشرے میں اسکی ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں نکلتی۔ کہاں تعددِ ازواج کا قرآنی تصور اور کہاں

ہماری معاشرت میں سوت کا تصور۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

لفظ سوت کے اثرات ہمارے معاشرے پر اچھے نہیں پڑے۔ اور اس سوت سے سوتیلا اور سوتیلی کے الفاظ بنائے گئے۔ اس لیئے ناممکن تھا کہ سوت سے مشتق ہونے والے الفاظ میں اس کے بنیادی معنی نہ پائے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ سوتیلا اور سوتیلی میں بھی سوت کی منفی معنویت پوری طرح موجود ہے۔ جبکہ لفظ سوتیلا کے مقابلہ پر اسلام نے اخیافی اور علاتی کی اصطلاحیں پیش کی ہیں۔ (یعنی ماں شریک یا باپ شریک) اور یہ تفریق بھی بنائے ضرورت ہے تاکہ وراثت کے موقع پر جائز حقداروں کو ان کا حق دیا جاسکے۔ اور ان ہر دو الفاظ میں کسی قسم کا منفی مفہوم بھی شامل نہیں ہے۔ لیکن ہماری معاشرت میں رائج سوتیلا کے لفظ میں تفریق کے ساتھ نفرین کا معنی بھی ہمرکاب ہوتا ہے۔ یعنی سوت کی نسبت کا مفہوم بھی۔ جو اپنی پیدائش کے وقت سے ہی حریف سمجھ لیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرت میں چونکہ سوتیلا کے مقابلہ پر ماں شریک یا باپ شریک کے الفاظ مستعمل ہوتے ہیں۔ اس لیئے ماں یا باپ کی نسبت سے پکارے جانے والے بچوں میں باہمی نفرت و وحشت کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟۔ کیونکہ اس میں ماں یا باپ کی نسبت کا لحاظ جو ہوتا ہے۔ برخلاف سوتیلے بچوں کے کہ جن میں سوت کی نسبت ملحوظ ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ سوت کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے اس لیئے سوتیلے کو بھی اچھا نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی مفہوم کے لیئے ادا کیئے جانے والے الفاظ یا اصطلاحات نہ صرف اپنے اندر اپنے وضع کی پوری تاریخ رکھتے ہیں، بلکہ وہ اثرات کے اعتبار سے معاشرت پر مستولی بھی رہتے ہیں۔ کوئی معاشرہ بھی ان لفظوں کے اثر سے خالی نہیں ہوتا۔ لفظوں کی اثر آفرینی اور طاقت پر سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔

مسلم معاشرہ کی اپنی الگ پہچان ہے جو اپنے معتقدات و نظریات اور قانون تعامل سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کے رسم و رواج اور عرف و عادت بھی اس کے لیئے شناخت کا کام انجام دیتے ہیں لیکن مسلم سماج میں لفظوں کے غلط انتخاب کے باعث اگر کوئی مثبت عمل، منفی معنی دینا شروع کردے، تو اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرہ کو ان الفاظ کا متبادل فراہم کریں، تاکہ منفی الفاظ کو ترک کیا جاسکے۔

چونکہ سوت اور سوتیلا کے الفاظ میں جس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے وہ منفی طرز عمل کے سوا کچھ نہیں۔ جبکہ یہی حقیقت قرآن مجید میں ایک مثبت عمل کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ اس لیئے معاشرہ میں رائج ان اصطلاحات کو شرف بہ قرآن کرتے ہوئے، تبدیل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ان اصطلاحات کے ترک سے معاشرہ میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہونے کے امکان کو بہر حال رد نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن مجید نے کسی خاوند کی پہلی بیوی کو جس طرح زوج کہا ہے اسی طرح اسکی دوسری بیوی کو بھی زوج ہی کہا ہے۔ سوت نہیں کہا۔

وان اردتم استبدال زوج مکان زوج۔ (النساء/۲۰)

اور جب تم ایک بیوی کو دوسری بیوی سے بدلنا چاہو۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ شوہر کی زندگی میں آنے والی ہر بیوی، خواہ وہ پہلی ہو یا دوسری، بطور زوج کے ایک مستقل حیثیت اور مقام کی مالک ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ پہلی بیوی زوج ہو اور بعد میں آنے والی سوت ہو یا دونوں ایکدوسرے کی سوت ہوں۔ یہ تصور قرآن کے مطابق اس لیئے نہیں ہے کہ قرآن نے رشتۂ ازدواج کو لازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ۔ (الروم/۲۱) اور لیسکن الیھا (الاعراف/۱۸۹) کے الفاظ سے اسکی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رشتۂ ازدواج میں تمہارے لیئے تسکین اور باہمی مودّت ورحمت رکھی گئی ہے۔ پھر بمطابق قرآن یہ رشتہ بالعموم صورت احدیٰ میں قائم ہوتا ہے۔ اور گاہ بگاہ صورت تعدد میں بھی۔ اس لیئے دونوں صورتوں میں تسکین اور باہمی مودّت ورحمت کا عنصر یکساں طور پر تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ مرد کی اگر ایک بیوی ہو تو وہ تسکین کا باعث ہو۔ اور اگر دو ہو جائیں تو موجب تکلیف بن جائیں۔ اگر صورت معاملہ یہی ہوتی تو اللہ علیم وخبیر، رؤف ورحیم ایسا حکم کبھی نہ دیتا۔ اگر صورت معاملہ یہی ہوتی تو اللہ علیم وخبیر، رؤف ورحیم اپنا حقی نفرت آگیں، وحشت خیز، اور حتمی حکم کبھی نہ دیتا۔

غور کیجیئے!! اگر دو یا دو سے زائد بیویاں اپنی اصل میں ایکدوسرے کی حریف، رقیب اور دشمن ہوں تو ان کے مابین منافرت، مناقشت اور منازعت کیا ان کے شوہر پر اثر انداز نہیں ہوگی؟ جس کے نتیجہ میں وہ شوہر، اپنی بیویوں سے بجائے تسکین پانے کے، تکلیف نہیں پائے گا؟ اور اس طرح تعدد ازواج کا حکم، ایک حتمی حکم بلکہ شریعت اسلامی کے نقص کا ایک چلتا پھرتا ثبوت نہیں بن جائے گا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سارا شاخسانہ لفظ سوت کے اس تصور کا ہے کہ جس نے اسلام کے تعدد ازواج کے تصور کو گہنا دیا ہے۔

عورتوں کے لیئے ان کے شوہروں کی پہلی بیویوں کے بیٹوں کے حق میں قرآن نے جو الفاظ استعمال کیئے ہیں۔ وہ قابل توجہ ہیں: او ابناء بعولتھن۔ یا شوہروں کے بیٹے (النور/۳۱)

یہ نہیں کہا کہ سوتیلے بیٹے۔ یعنی بیٹوں کو 'سوت' سے نہیں بلکہ ان کے شوہروں سے نسبت دی گئی ہے۔ مگر مذہب غیر کی معاشرت کے زیر اثر ہم اس رشتے کو اپنے پن کی بجائے سوتیلے پن کا رشتہ سمجھے بیٹھے ہیں اور اس لیئے دوسری شادی کو معیوب سمجھتے ہیں کہ جس کے نتیجے میں اپنے تئیں سوتیلا رشتہ وجود میں آتا ہے۔ یہ ہمارے معاشرہ کی جہالت ہے۔ قرآن کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

اس طرح 'ربائب' کا لفظ دیکھئے:

وربائبکم التی فی حجورکم من نسائکم۔ (النساء/۲۳) اور تمہاری عورتوں کی وہ بیٹیاں، جو ان کے پہلے شوہروں سے ہوں اور تمہاری پرورش اور تربیت میں ہوں۔

اس آیت میں لفظ 'ربائب' توجہ طلب ہے۔ یہ ربیبہ کی جمع ہے۔ جو فعیل کے وزن پر معنی مفعول میں ہے۔ یعنی مربوبۃ'' جس کا مطلب ہے وہ لڑکی جس کی پرورش اور تربیت کی جائے اس لیئے یہ خوشگوار فریضہ انجام دینے والے مرد (باپ) کو 'رابّ'' کہتے ہیں۔

'امام راغب کے بقول لفظ رابّ'' اور رابّۃ'' خاوند اور بیوی دونوں سے مخصوص ہے۔ جس وقت کہ وہ پہلے زوج کے بچے کی پرورش اور تربیت کریں۔ اس معنی پر وہ بچہ بھی ربیب یا ربیبہ کے لفظ سے مخصوص ہے۔

واختص الرابّ والرابّۃ'' باحد الزوجین اذا تولی تربیۃ الولد من زوج کان قبلہ والربیب والربیبۃ بذلک الولد۔ (۵)

اس کا مادہ ربّ'' ہے، جس کے بارے میں المفردات میں لکھا گیا ہے۔

الربّ فی الاصل التربیۃ وھو انشاء الشیء حالاً فحالاً الی حدّ التمام (۶)

ربّ اصل میں پالنے اور تربیت کرنے والے کو کہتے ہیں یہ وہ ہستی ہے۔ جو کسی چیز کو بتدریج ترقی دیتے ہوئے کمال کی آخری حد تک پہنچادے۔

اور اس معنی میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی رب کہلانے کا مستحق نہیں۔ الحمد للہ رب العٰلمین۔ اور قرآن مجید نے والدین کو جو چھوٹا رب، کہا ہے کما ربیانی صغیرا۔ (اسراء/۲۴) اسکی اصل بھی یہی ہے کہ ماں باپ بھی اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت اسی انداز میں کرتے ہیں کہ انہیں اپنی حیثیت، توفیق اور بساط کے مطابق، آہستہ آہستہ درجۂ کمال تک پہنچاتے ہیں۔

وضاحت مذکورہ سے باآسانی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ لفظ 'ربیبہ' اپنے اندر صدفی صد مثبت مفہوم رکھتا ہے۔ یعنی ربیبہ وہ رشتہ ہے۔ جو اپنی حقیقی اولاد کے مماثل مفہوم کا حامل ہے۔ اس میں 'سوتیلے پن' کا ادنیٰ شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ پھر یہ کہ اسے عورت کے پہلے شوہر سے منسوب کیا گیا ہے اس لیئے بھی اسمیں سوتیلے پن کا کوئی تصور اخذ نہیں ہوتا کہ مردوں کے لیئے 'سوت' کا لفظ ناقابل استعمال ہے۔ چنانچہ جو لوگ ربیبہ کا مطلب 'سوتیلی لڑکی' سے ادا کرتے ہیں۔ وہ قرآنی لفظ کے معنوی حسن وکمال کو غارت کرتے ہیں۔ اس غارت گری کا ایک نمونہ 'علمی اردو لغت' میں ربیب کے معنی میں ملاحظہ ہو۔

سوتیلا بیٹا، جو پہلے خاوند سے ہو۔

اس مثال میں وہی غلطی پائی جاتی ہے جو زوج اُخریٰ کو سوت کے لفظ سے تعبیر کرنے میں لوگوں سے ہوئی تھی مگر افسوس کہ یہ غلطی صرف اردو لغت وادب تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ہمارے تفسیری ادب تک جا پہنچی، تفسیر نعیمی میں لکھا ہے۔

''یہاں ربیبہ سے مراد وہ لڑکی ہے جو اپنی بیوی کے پیٹ سے ہو، دوسرے خاوند سے یعنی سوتیلی بیٹی، چونکہ عموماً سوتیلی لڑکی ماں کے ساتھ رہتی ہے، اور سوتیلا باپ ہی اسکی پرورش کرتا ہے۔ اس لیئے ربیبہ کہتے ہیں''۔(۷)

مذکورہ بالا عبارت میں سوتیلی بیٹی، سوتیلی لڑکی اور سوتیلا باپ، کے الفاظ سے جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سے لفظ ربیبہ کی قرآنی معنویت کا حسن و جمال ماند پڑ گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ سب کچھ جان بوجھ کر لکھا گیا ہے۔ مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ مذکورہ عبارت میں مسلمانوں کی معاشرت میں ہندی معاشرت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

ہمارے اردو کے تفسیری ادب میں یہ الفاظ، بانداز دگر، سوکنوں کے تعلق سے دوسرے مفسرین کے ہاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی جمع بین الاختین کی ممانعت کی علت، کے زیر عنوان رقمطراز ہیں:

''قرآن حکیم انسانی فطرت کے اس تقاضے کو ابھارنا چاہتا ہے کہ جہاں رحمی رشتے کی قربت قریبہ موجود ہو، وہاں باہمی ارتباط کی فطری بنیاد رأفت و رحمت ہی ہونی چاہیئے۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ ان اسباب کو دبا دیا جائے جو رحمی رشتوں کے اندر رشک و رقابت کا زہر گھولنے والے ہوں۔ چونکہ دو بہنوں کے بیک وقت کسی کی قید نکاح میں ہونے کی صورت میں اس کا غالب امکان ہے کہ دو بہنیں، بہنیں ہوتے ہوئے بھی سوکنوں کے جلاپے اور رشک و رقابت کے جذبات میں مبتلا ہو جائیں، اس وجہ سے اس کا دروازہ بند کر دیا ہے۔''(۸)

پیر محمد کرم شاہ الازہری رقمطراز ہیں:

''دو بہنوں کو خواہ وہ حقیقی ہوں یا رضاعی، ایک نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے، اور حضور کریم ﷺ نے پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی کا ایک عقد میں جمع کرنا ممنوع فرمایا ہے اور اسکی وجہ یہ بیان فرمائی کہ یہ رشتے محبت و پیار کے رشتے ہیں، اگر یہ ایک دوسرے کی سوکنیں بن جائیں گی تو محبت و انس کی جگہ حسد و عناد، جو عام طور پر سوکنوں میں پایا جاتا ہے رونما ہو جائے گا۔''(۹)

تفسیر نمونہ کے مفسر ارقام فرماتے ہیں:

''اسلام نے اس قسم کی شادی سے کیوں روکا ہے۔ شاید اسکی رمز یہ ہو کہ دو بہنیں طبعی اور فطری نسبی رشتے کی وجہ سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں۔ لیکن جب وہ ایک دوسرے کی رقیب بن جائیں گی تو وہ پہلی فطری محبت باقی نہ رہے گی بلکہ ایک قسم کا تضاد ان میں جنم لے گا جو انکی زندگی کے لیئے انتہائی مضر ہے کیونکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے جذبہ محبت اور جذبۂ رقابت ان کے دلوں میں باہم برسر پیکار رہیں گے''۔(۱۰)

مولانا غلام رسول سعیدی ارقام فرماتے ہیں:

''اس نکاح کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ رحم کے رشتے ہیں اور سوکنوں میں عداوت اور جلاپا ہوتا ہے، سو اگر دو بہنوں، خالہ اور بھانجی دونوں کو ایک نکاح میں جمع کر لیا جائے تو یہ صلۂ رحم کے منافی ہے اور قطعیت رحم کو مستلزم ہے''۔(۱۱)

دو حقیقی، علاتی، اخیافی اور رضاعی بہنوں نیز خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کے بیک وقت نکاح میں جمع نہ کرنے کی حکمت آپ نے مذکورہ بالا مفسروں کی زبانی ملاحظہ فرمائی۔ اس کا خلاصہ ایک بار پھر ملاحظہ فرمالیں۔ دو بہنوں کے بیک وقت کسی کے نکاح میں ہونے کی صورت میں بہت ممکن تھا کہ دو بہنیں، بہنیں ہونے کے باوجود، سوکنوں کے جلاپے اور رشک و رقابت کے جذبات میں مبتلا ہو جاتیں۔ اور سوکنیں بننے کی صورت میں ان میں باہمی محبت و انس کی جگہ حسد و عناد رونما ہو جاتا، جو عام طور پر سوکنوں میں پایا جاتا ہے۔ سوکن بن جانے کی صورت میں وہ ایک دوسرے کی رقیب بن جاتیں، ان میں ایک قسم کا تضاد پیدا ہو جاتا جو ان کی زندگی کے لیئے انتہائی مضر ہوتا۔ چونکہ سوکنوں میں عداوت اور جلاپا ہوتا ہے جو صلہ رحمی کو ختم اور قطع رحمی کو لازم کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے مذکورہ مفسرین کی تفسیروں میں آپ نے سوکنوں کے الفاظ و تصورات ملاحظہ فرمائے جو سب کے ہاں متفقہ طور پر منفی مفاہیم و مطالب پر مشتمل ہیں۔ دراصل ہم یہی دکھانا چاہتے تھے کہ ہمارا تفسیری ادب بھی اپنے علم و فضل کے باوصف معاشرتی رویوں اور اردو لغت وادب کا شکار ہونے سے بچ نہیں سکا ہے۔

ان حوالوں کا حاصل یہ نکلا کہ سوکنوں کا رشتہ چونکہ اچھا نہیں ہوتا۔ اس لیئے اللہ رب العزت نے دو بہنوں میں اسے پسند نہیں فرمایا مگر ساتھ ہی یہ نتیجہ بھی نکلا کہ دو بہنوں کے سوا باقی خواتین میں باہمی جلاپے، رشک و رقابت، حسد و عناد اور زندگی کے تضاد پر مشتمل اس منفی رشتے کو پسند کر لیا گیا ہے۔ (ہم اس

نتیجے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں) اگر اسلام کا تعدد ازدواج اپنے نتیجے کے اعتبار سے انہی مطالب پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا تو گستاخی معاف! کیا قانون خداوندی کی ایسی تشریح کو توہین قانون کے ذیل میں نہیں لیا جا سکتا؟ یہ ہم سب کے سوچنے کا مسئلہ ہے۔

کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

ہم سمجھتے ہیں کہ خدائی شریعت، اپنے ہر حکم میں کامل و مکمل اور ہزار ہا خوبیوں اور حکمتوں پر مشتمل ہے، البتہ مسلمانوں کا اس پر، اسکی اسپرٹ کے مطابق عمل نہ کرنا، شریعت کے نقص یا اسکے مبنی بر غلط ہونے کی دلیل نہیں بنتا۔ بلکہ خود مسلمانوں کے مبنی بر غلط ہونے کی دلیل بنتا ہے۔ خدائی احکام، ہمیشہ سے ناقابل شکست رہے ہیں۔ لوگوں نے اگر اپنی فطرت کو مسخ کر لیا ہو تو اس میں شریعت کا کیا قصور؟

آنکھیں اگر ہوں بند تو پھر دن بھی رات ہے
اس میں قصور کیا ہے بھلا آفتاب کا

حوالہ جات

۱۔ علمی اردو لغت (جامع) وارث سرہندی، ص ۱۶۷، علمی کتاب خانہ، کبیر سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، طبع ۲۰۰۰ء
۲۔ علمی لغت، ص ۹۳۶
۳۔ کتابستان کمپوزٹ ڈکشنری، ص ۳۸۹، بشیر احمد قریشی، کتابستان پبلشنگ کمپنی، ۳۸، اردو بازار، لاہور، ترمیم شدہ ایڈیشن، ۱۹۹۸ء
۴۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۱۲، ص ۱۷۰، اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ) کراچی، ۱۹۹۱ء
۵۔ المفردات فی غریب القرآن (عربی) ص ۱۸۵، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی
۶۔ ص ۱۸۴
۷۔ مفتی احمد یار خان نعیمی، اشرف التفاسیر المعروف بہ تفسیر نعیمی، جلد ۴، ص ۴۳۹، تفسیر زیر آیت النساء ۲۳، مکتبہ اسلامیہ، مفتی احمد یار خان روڈ، گجرات، پاکستان
۸۔ تدبر قرآن، جلد ۲، ص ۲۶۷، فاران فاؤنڈیشن، ۱۲۲، فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور، طبع اول ۱۹۸۳ء
۹۔ ضیاء القرآن، جلد اول، ص ۳۳۳، تفسیر زیر آیت النساء ۲۳، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور، ۱۴۰۲ھ، ۱۹۸۲ء
۱۰۔ تفسیر نمونہ، جلد ۳، ص ۱۱، مترجم مولانا سید صفدر حسین نجفی، مصباح القرآن ٹرسٹ، لاہور، ۱۴۱۷ھ
۱۱۔ تبیان القرآن، جلد ۲، ص ۶۲۳، فرید بک سٹال، ۳۸، اردو بازار، لاہور، طبع ثانی ۲۰۰۱ء

....

اسلامی قانون کے ارتقاء میں اجتہاد کا کردار

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری
ممبر، اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان

مصر کے معروف عالم مرحوم ڈاکٹر احمد امین نے مسلم دنیا کے فکری انحطاط پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ تقریباً پانچ سو سال سے مسلمانوں نے فکری میدان میں جو کچھ لکھا ہے، اگر اسے غرق دریا کر دیا جائے تو اس سے علم و ادب کو کوئی نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا۔ ہر چند ڈاکٹر موصوف کی تنقید میں قدرے شدت پائی جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے مسلمانوں کے فکری زوال کو بیان کرنے اور انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے وہی کچھ کہا ہے جو ان سے پہلے دور حاضر کے مسلم مفکرین کہہ چکے ہیں۔ مسلم مفکرین نے اس دعویٰ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ شیخ جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا تھا: "یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، چہ معنی دارد؟ (قرآن و سنت) کی کس نص سے یہ دروازہ بند کیا گیا ہے۔ اور کس امام نے یہ کہا ہے کہ میرے بعد مسلمانوں کو دین میں بصیرت و ادراک حاصل کرنا مناسب نہیں ہے یا انہیں قرآن مجید اور حدیث صحیح سے ہدایت حاصل کرنی نہیں چاہیے یا ان کے مفہوم و مراد کی گہرائی میں اترنے اور اسے وسعت دینے کے لیے سعی و نشاط سے کام لینا نہیں چاہیے۔[1]

بے شبہ مسلم تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ مسلمان اپنے دور انحطاط میں اسی مرض میں مبتلا ہوئے جس میں ان سے قبل بعض دوسری مذہبی جماعتیں مبتلا ہو چکی تھیں۔ لیکن دوسری جماعتوں کا فکری جمود و تعطل میں مبتلا ہونا چنداں حیرت انگیز نہیں کیوں کہ بقول رسل Russell ان کے مذہبی صحیفوں میں ہمیں ایک لفظ بھی ذہانت کی تعریف میں نہیں ملتا۔ رسل کا کہنا ہے کہ:

"So far as I can remember there is not one word in the

Gospels in praise of intelligence."

لیکن قرآن مجید نے بار بار انسانی فکر وعقل سے خطاب کرتے ہوئے ان لوگوں کی سخت مذمت کی ہے جو کائنات کے حقائق ودقائق کا مشاہدہ کرنے سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں، جو قدم قدم پر تاریخ کے نشانات پر غور وفکر کرنے سے انکار کرتے ہیں قرآن نے ایسے لوگوں کی عقل ودانش اور ہوش وحواس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے پاس عقل ہے، لیکن سوچ بچار سے کام نہیں لیتے ان کے پاس آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں ان کے پاس کان ہیں لیکن سنتے نہیں یہ لوگ گمراہی میں حیوانات سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ (الاعراف، آیت نمبر ۱۷۹)

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ قرآن مجید، اسلامی فکر کا بنیادی ماخذ ہے اور انسانی سعادت وہدایت کا سرچشمہ، چنانچہ جب قرآن مجید اور رسول کریم ﷺ کی تعلیم وتربیت نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی فکری صلاحیتوں کو بیدار کیا اور ان کی بے کیف زندگیوں میں معنویت پیدا کی، تو انہوں نے روحانی طور پر ایک نیا جنم لیا، اب قرآن ان کی فکر ونظر کا مرکز تھا۔ اس کی تعلیمات اور اس کے اسرار وحکم ان کی سوچ بچار کا محور، انہوں نے قرآن مجید کے فلسفہ وحکمت کو سمجھنے کے لیے مقدور بھر محنت سے کام لیا، یہی فکری ریاضت ہے جسے ہم آج اجتہاد سے یاد کرتے ہیں۔ ۳ چوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اپنی ذہنی صلاحیتوں میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس لیے قرآن فہمی اور اس کے حقائق ومعانی کے ادراک میں بھی وہ یکساں مقام نہیں رکھتے تھے۔ اگر انہیں قرآن کے کسی مقام پر کوئی مشکل پیش آتی تو وہ آنحضرت ﷺ سے رجوع کرتے، اور آنحضرت ﷺ بعض اوقات کسی مسئلہ کو کسی بزرگ کے حوالے کردیتے، جو آپ کی موجودگی میں اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتے، اس سے مقصد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی فکری صلاحیتوں کو جلا بخشنا تھا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نہ صرف قرآن مجید کے معانی پر غور وفکر کرتے بلکہ رسول اللہ ﷺ کے فرمودات پر بھی سوچ وبچار کرتے۔ اور وہ الفاظ کے ظاہری معانی کے ادراک پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں علماء نے متعدد واقعات نقل کیے ہیں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے یوم احزاب کے موقع پر فرمایا کہ نماز عصر بنی قریظہ پہنچ کر ادا کی جائے گی لیکن ہوا یہ کہ راہ ہی میں وقت نماز آ گیا۔ جس پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے کہا کہ ہم تو منزل پر پہنچ کر ہی نماز پڑھیں گے، لیکن دوسرے بزرگوں نے فرمایا کہ نہیں! ہم تو ابھی نماز پڑھیں گے، رہا رسول کریم ﷺ کا یہ فرمان کہ منزل پر پہنچنے سے پہلے نماز نہ پڑھی جائے تو اس فرمان کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے میں جلدی اور تیزی سے کام لینا

چاہیے۔ ورنہ یہ مطلب نہیں کہ راہ میں نماز ہی نہ پڑھی جائے۔ القصہ جب آنحضرت ﷺ کے سامنے اس واقعہ کا ذکر آیا تو آپ ﷺ نے کسی فریق کو ہدف ملامت نہیں بنایا۔ یعنی جن بزرگوں نے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے فرمان کا مطلب منزل تک جلد پہنچنا تھا، نماز پڑھنے سے روکنا نہیں تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے یہ نہیں فرمایا کہ آخر تم لوگوں نے حدیث کے ظاہری مفہوم ومراد پر عمل کیوں نہیں کیا۔ ۳۲ اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ بھی آنحضرت ﷺ کے سامنے ہی پیش آیا۔ جب قبیلۂ بنی نضیر سے جنگ کا واقعہ پیش آیا تو مسلم فوج نے خالص جنگی نقطۂ نظر سے بعض درختوں کو کاٹ دیا جو محاصرہ کی راہ میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ یہ امر یعنی درختوں کا کاٹنا بظاہر قرآن کی اس آیت کے خلاف تھا جس میں فساد فی الارض کی مذمت کی گئی ہے۔ قرآن نے فرمایا ہے:

واذا تولیٰ سعیٰ فی الارض لیفسد فیھا ویھلک الحرث والنسل۔

یعنی جب یہ مفسد برسر اقتدار آتے ہیں تو فصلوں اور نسلوں تک کو برباد کردیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں مسلم فوج شام کی طرف بڑھی تو خلیفہ راشد نے ان سے فرمایا۔ "دیکھنا! پھل دار درختوں اور فصلوں کو نہ کاٹنا، نیز یہ کہ انسانی بستیوں کو ویران نہ کرنا"۔ چنانچہ جب جنگی مصلحت کے پیش نظر بنی نضیر کے درختوں کو کاٹا گیا تو انہوں نے شور مچایا کہ محمد ﷺ ایک طرف تو فساد فی الارض سے روکتے ہیں لیکن دوسری طرف خود ان کے ساتھی درختوں کو کاٹ رہے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اس اجتہادی قدم کو کہ جنگی ضرورت کے پیش نظر درختوں کا کاٹنا گزیر تھا، قرآن مجید نے سورہ الحشر، میں جائز قرار دیا اور اسے فساد فی الارض سے تعبیر نہیں کیا۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید کی کسی نص کے عمومی حکم کو کسی دوسری مصلحت کے پیش نظر (جس کا ادراک انسانی عقل نے مقدور بھر سوچ کے بعد کیا ہے اور قرآن وسنت کے فلسفہ وحکمت کی روشنی میں کیا ہے) محدود کیا جاسکتا ہے۔

آثار واحادیث میں ایسے کئی واقعات کا تذکرہ آیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے کسی قرآنی نص یا حدیث کا مفہوم نہیں سمجھا تھا، تو آں حضرت ﷺ یا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں صحیح مفہوم سے آگاہ فرمایا، اس قسم کے واقعات سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں جب ممتاز صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن یا آنحضرت ﷺ کے فرمودات مبارکہ کی تشریح میں اجتہاد سے کام لیا تو آنحضرت ﷺ نے اسے پسند فرمایا کیونکہ ان کا اجتہاد روح

شریعت یا روح عدل سے قریب تھا اور شریعت کے بنیادی مقاصد کو پورا کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایسے اجتہاد پر مسرت کا اظہار فرمایا۔ آپ ﷺ نے ایک بار حضرت معاذ بن جبل سے جو یمن میں گورنر بن کر جا رہے تھے۔ فرمایا کہ اگر تم قرآن و سنت میں کسی قضیہ کا حل نہ پاؤ تو پھر کیا کرو گے؟ تو پھر میں اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا (اجتھد برائی) حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں عرض کیا۔ رسول کریم ﷺ نے اس جواب کو پسند فرمایا۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اپنی جس رائے یا اجتہاد کا ذکر کیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی رائے کو اختیار کرنے کا مشورہ قاضی شریح کو دیا تھا۔ آپ نے قاضی صاحب موصوف کو لکھا تھا کہ اگر تمہیں فیصلہ کرتے وقت اللہ کی کتاب، رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں اور آئمہ سے کوئی چیز نہ ملے تو پھر اپنی رائے سے کام لیتے وقت خوب محنت سے کام لو اور اہل علم سے مشورہ کرو (فاجتهد برأيك واستشر اهل العلم والاصلاح) اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

"میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! ہمیں بعض اوقات ایسے امور سے واسطہ پڑتا ہے جن کے بارے میں نہ تو قرآن مجید میں کچھ نازل ہوا ہے اور نہ ہی آپ کی سنت نے کوئی فیصلہ دیا ہے"۔ اس پر رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

"ایسی صورت میں مومنین میں سے اہل علم کو اکٹھا کرو اور زیر بحث مسئلہ کو باہمی مشورہ سے طے کرو اور کسی ایک رائے پر (بغیر مشورہ) فیصلہ نہ دو"۔

ان واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح ہوگا کہ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ زندگی تغیر پذیر واقع ہوئی ہے اور نیا دن، نیا وقت اپنے جلو میں نئے مسائل اور نئی مشکلات لاتا ہے، جن سے مسلمان مسلسل غور و فکر اور باہمی صلاح مشورہ ہی سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اجتہاد اور رائے کا دائرہ وسیع نہیں تھا۔ انہیں جب کوئی نیا مسئلہ پیش آتا تو وہ آنحضرت ﷺ سے پوچھتے، آپ یا تو انہیں قرآن مجید کے احکامات سے آگاہ فرماتے یا اپنی طرف سے کوئی فیصلہ صادر فرما دیتے، یہ فیصلہ قرآن مجید ہی کے احکام کی تشریح و تفسیر شمار کیا جاتا۔ مثلاً قرآن نے ماں بیٹی، یا دو بہنوں سے ایک ہی وقت میں شادی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے اس حکم میں مزید اضافہ فرمایا کہ پھوپھی اور بھتیجی یا خالہ اور بھانجی

سے بھی ایک ہی وقت میں عقد نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ﷺ کے وصال کے بعد اجتہاد کا دائرہ وسیع ہوا۔ اب جدید مسائل اور مشکلات کے حل۔ کے لیے آپ کی ذات گرامی، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے درمیان موجود نہ تھی۔ جس کی وجہ سے فلسفہ قرآن و سنت کی روشنی میں انسانی عقل و بصیرت کو کام کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوئے۔ جس سے اجتہاد کو ایک بلند مقام نصیب ہوا۔ اور اسے اسلامی تشریع میں تیسرا بنیادی ماخذ شمار کر لیا گیا۔ لیکن یہ اجتہاد جسے رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے لفظ رائے بھی کہا ہے۔ عموماً اجتماعی مشورے کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا تھا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں خاص طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں مدینہ میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا اجتماع ہوتا اور زیر بحث قضیہ پر آزادانہ غور و فکر کے بعد کسی ایک رائے کو لازمی قرار دیا گیا اور اسی اجتماعی رائے کو اجماع سے بھی تعبیر کیا گیا۔ اس اجتماعی رائے کی صحت پر علماء نے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۱۵ سے استدلال کیا ہے۔ اس آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى و يتبع غير سبيل المؤمنين
نوله ما تولى

یعنی جو آدمی رسول ﷺ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور اہل ایمان کی راہ کے سوا کسی اور راہ پر چلے حالانکہ اس پر راہ ہدایت کھل چکی ہے تو اس کو ہم اسی راہ پر چلائیں گے جس پر وہ خود چلے گا۔ اسی معنی میں آنحضرت ﷺ سے ایک روایت بھی مروی ہے۔ جس میں آپ نے فرمایا کہ میری امت غلطی پر یک جا نہیں ہوگی۔

یہاں یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اجتہاد کا یہ شرف صرف انہی بزرگوں رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے حصہ میں آیا جنہیں خدا نے حکمت و دانش سے نوازا تھا اور قرآن فہمی کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے نہ صرف سیاست اور معیشت کے مسائل میں اجتہاد فرمایا اور نئے تجربے کیے بلکہ ان مسائل میں بھی اجتہاد فرمایا جس میں قرآن و سنت اپنا فیصلہ دے چکے تھے۔ لیکن جدید وقت کے تقاضوں کے پیش نظر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے نصوص کی تشریح و تاویل میں حق و صداقت کی نئی نئی جہتوں کو دریافت کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے جو اجتہادات فرمائے اہل علم نے ان کے تین درجات مقرر کیے ہیں۔

ا۔ ان اجتہادات کا تعلق قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر سے تھا۔

۲۔ کسی زیر بحث مسئلے کو کتاب وسنت میں اس سے ملتے جلتے مسائل، یعنی امثال واشباہ پر قیاس کرنا۔

۳۔ اجتہاد کا کسی خاص معین نص پر انحصار کرنے کے بجائے روح شریعت پر انحصار کرنا۔ علماء نے کہا ہے کہ شریعت مقدسہ کا منتہائے نظر مخلوق کی بھلائی ہے۔ جس جگہ یہ بھلائی پائی جائے گی وہی شریعت ہوگی۔ [5] اجتہاد میں یہ بات بھی پیش نظر رکھی گئی کہ جس چیز کو مسلمان اجتماعی طور پر بہتر جانتے ہیں وہ چیز عند اللہ بھی حسن اور بہتر ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد میں چند ایسے احکام بھی جاری کیے، جو بہ ظاہر قرآن کے صریح حکم سے متصادم نظر آتے ہیں۔ یا آپ نے بعض احکام کو موقوف کر دیا، جن پر عہد رسالت میں عمل ہوتا تھا۔ مثلاً جب عراق اسلامی ریاست کا حصہ بنا تو آپ نے عراق کی زمینوں کو فوجیوں میں تقسیم کرنے کے بجائے ریاست کی ملکیت قرار دیا۔ مفتوحہ اراضی کی تقسیم کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کئی روز تک صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے بات چیت کی۔ اس مسئلہ پر دو رائیں تھیں۔ بعض بزرگوں کا کہنا تھا کہ ان زمینوں کو فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جیسا کہ خود رسول کریم ﷺ نے خیبر کی زمینوں کو تقسیم فرما دیا تھا۔ دوسری رائے یہ تھی کہ ان زمینوں کو ریاست کی ملکیت میں دے دیا جائے۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو اس رائے کے حق میں تھے یہاں تک کہا: اگر آپ نے (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ان زمینوں کو تقسیم کر دیا (اور ریاست کی تحویل میں نہ دیا) تو یہ لوگ (فوجی) بہت بڑے سرمایہ کے مالک بن جائیں گے ان کے مرنے کے بعد یہ ساری جائیداد کسی ایک آدمی یا عورت کی طرف منتقل ہو کر رہ جائے گی۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر معروف دوالبی نے لکھا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی تقریر میں اسی چیز کی (اکتناز دولت) مذمت کی ہے، جس کی برائی آج کے سوشلسٹ کر رہے ہیں، یعنی اللہ کی وسیع سرزمین بالآخر ایک شخص کی ملکیت میں آجائے گی جس پر کاشت کاروں کی ایک بڑی جماعت کام کرے گی جن کی محنت پر ایک آدمی داد عیش دے گا۔ [6] الغرض عراقی زمینوں کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے موقف کی حمایت میں سورۃ الحشر کی آخری آیات سے استدلال کیا۔ جن میں کہا گیا ہے کہ ''سرمایہ صرف مالدار آدمیوں ہی میں گردش نہ کرتا رہے''۔ بالآخر مہاجرین اور انصار کے ارباب حل وعقد نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے سے اتفاق کیا اور طے پایا کہ ان اراضی کو ریاست کی تحویل میں دے دیا جائے''۔ [7]

انہی اجتہادات میں سے ایک اجتہاد یہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرب سوسائٹی

سے غلامی کی رسم کو ختم کرنے کے لیے قانونی قدم اٹھایا، اور فرمایا کہ آئندہ کسی عرب کو غلام نہیں بنایا جاسکے گا یا جو باندی صاحب اولاد ہوگئی ہے اس کی خرید وفروخت ممنوع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان اجتہادات میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن مجید کی کسی نص کو معطل یا موقوف نہیں کیا بلکہ بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر قرآنی نصوص کی جدید تعبیر کی، جو شریعت کے مزاج اور فلسفہ حکمت سے مطابقت رکھتی تھی یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جدید حالات کے پیش نظر اپنے ہی ایک فیصلہ کو دوسرے وقت میں بدل دیا تھا۔ مثلاً آپ نے میراث کے قضیہ میں حقیقی اولاد کو میراث سے محروم رکھنے کا فیصلہ دیا۔ لیکن جب یہی مسئلہ ایک عرصہ کے بعد دوبارہ ان کے سامنے آیا تو انہوں نے حقیقی اولاد اور ماں میں شریک اولاد دونوں کو میراث میں حصہ دینے کا فیصلہ صادر فرمایا، جب آپ سے آپ کے پہلے فیصلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا: پہلا فیصلہ وہی تھا جو ہم نے (اپنے اجتہاد کے مطابق اس وقت) صادر کیا تھا اور یہ فیصلہ جو ہم اب دے رہے ہیں (اس اجتہاد کے مطابق ہے)۔'' ذلک ما قضینا وهذا على ما نقضى ''۔ یہاں پر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہ صرف اپنے ایک فیصلہ کو دوسرے اجتہادی فیصلے سے بدلا، بلکہ اپنے عہد خلافت میں بعض ان فیصلوں کو بھی بدل دیا، جو خلیفہ اول نے اپنے زمانہ میں دیے تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ان فیصلوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا نہ ہوگا۔

۱۔ ایک مجتہد اپنی ایک اجتہادی رائے کو دوسری رائے سے بدل سکتا ہے۔

۲۔ ایک مجتہد حاکم اپنے سے پیشرو مجتہد حاکم کے فیصلوں کا پابند نہیں۔

۳۔ ہر نسل کو اپنی مشکلات خود ہی حل کرنی چاہییں، اس کے لیے اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے اپنے سے پہلی نسل کے فیصلوں کی پابندی ضروری نہیں ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے جنہیں اللہ نے مجتہدانہ بصیرت عطا فرمائی تھی کہا ہے: ''عہد حاضر میں مسلم دنیا کے رہنماؤں کا فرض ہے کہ مغرب میں جو انقلاب رونما ہوا ہے اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ پھر پورے اعتماد (ضبط نفس) اور گہری بصیرت کے ساتھ اسلام کے منتہائے اہداف Ultimate Aims کو بہ حیثیت ایک اجتماعی سیاست Social Polity پیش کریں''۔

علامہ نے مزید فرمایا: ''قرآن مجید کی تعلیمات جو زندگی کو ایک ترقی یافتہ تخلیقی عمل گردانتی ہیں یہ ضروری قرار دیتی ہیں کہ ہر نسل کو جو اپنے اسلاف کے (تخلیقی) کام سے روشنی حاصل کرتی ہے۔ اس بات کی اجازت دی جائے کہ وہ اپنے مسائل کو خود سلجھائے''۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت: ''ما